عارف عبدالمتین

کی

نعت گوئی

مُحمّد خالد جذبی

عارف عبدالمتین کی نعت گوئی

محمد خالد جذبی

وطن پبلیکیشنز گوجرانوالہ

جُملہ حقوق محفوظ

اشاعت اوّل :۔ جنوری ۱۹۸۷ء
مطبع :۔ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
تعداد :۔ ایک ہزار
قیمت :۔ پانچ روپے
ناشر :۔ وطن پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۴۰ گوجرانوالہ

عارف عبدالمتین کی نعت گوئی

محمد خالد جذبی

وطن پبلیکیشنز گوجرانوالہ

حرفِ اوّل

وطن پبلیکیشنز گوجرانوالہ کی پہلی پیش کش "اردو کے جدید نعت گو شعراء" کے سلسلہ کی پہلی کتاب "عارف عبدالمتین کی نعت گوئی" آپ کے ہاتھوں میں ہے انشاء اللہ اس سلسلہ کی دوسری کتب بھی آپ کی خدمت میں جلد پیش کر دی جائیں گی۔

جناب عارف عبدالمتین اردو کے معروف شاعر، ادیب اور نقاد ہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے انہوں نے اپنی شعری صلاحیتیں نعت گوئی کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ گذشتہ سال ان کا نعتیہ مجموعہ "بے مثال" بھی شائع ہوا ہے۔ جس کی اہلِ ذوق و محبت میں خوب پذیرائی ہوئی ہے۔

جناب عارف عبدالمتین کی نعت گوئی کا ایک خاص انداز ہے۔ ان کی نعتوں میں تخیل کی بلندی بھی ہے اور دل کا گداز بھی۔ ندرتِ اسلوب بھی ہے اور رعنائی فن بھی ان کے ہاں قدیم و جدید کا ایک ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو انہی سے مخصوص ہے اس دعویٰ کے ثبوت میں اس کتاب میں شامل ان کے نعتیہ اشعار پڑھ لیجئے ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

محمد خالد جنبی
یکم جنوری ۱۹۸۷ء

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۴ گوجرانوالہ

جدید اُردو نعت کے خدوخال

جدید اُردو نعت کے خدوخال کی تعیین کا فریضہ اس وقت تک بطریق احسن سرانجام نہیں دیا جاسکتا، جب تک ہم قدیم نعت کے نین نقش سے اجمالاً ہی سہی، آگہی حاصل نہیں کر لیتے اور نعت کی روایت سے مختصراً روشناس نہیں ہو جاتے۔ جیسا کہ تاریخ کے حوالے سے ہمیں پتہ چلتا ہے، عربی میں نعت کا آغاز حضرت ابوطالب سے ہوا، پھر مدینے کی لڑکیوں نے آنحضورؐ کی شان میں جو استقبالیہ اشعار پڑھے اور حضرت حمزہؓ حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ سے جو نعتیہ اشعار منسوب ہیں، ان سب کو نعت کے شروعات قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ انہیں بطورِ فن تخلیق نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ آنحضورؐ سے محبت و عقیدت اور ارادت کے بے محابہ بیساختہ اظہار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ . . . .

..... البتہ حسان بن ثابتؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، کعب بن زہیرؓ اور امام محمد بن سعید، شمس الدین بوصیریؒ کے ہاں نعت گوئی باقاعدہ فن کا اعزاز حاصل کر لیتی ہے، اور ہم حسان بن ثابتؓ کی زبان سے ایسا نعتیہ شعر بھی سننے کا شرف حاصل کرتے ہیں، جس کے بارے میں بعض فن شناسوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آج تک کسی زبان میں نعت کا کوئی شعر اس پر تفوق حاصل نہیں کر سکا۔ یہ شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حسان بن ثابتؓ کہتے ہیں۔

خُلِقْتَ مُبَرّاً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ   كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

ترجمہ: (یا رسول اللہؐ!) آپ کو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے۔   گویا آپ ہو بہو ایسے پیدا کئے گئے جیسے خود آپ نے چاہا تھا۔

پھر عبداللہ بن رواحہؓ ایسے محکم اور حکیمانہ نعتیہ شعروں کی دلپذیر پیش کش کا اہتمام کرتے ہیں۔

لولم یکن فیہ آیاتٌ مبینۃ   کانت بداھیۃ تغنی عن الخبر

ترجمہ: اگر اس کی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے والی واضح نشانیاں نہ بھی ہوتیں تو خود اس کی ذات اس کے پیغام کی صداقت کے لیے کافی ہوتی۔

پھر کعب بن زہیرؓ ایسا کیف آور قصیدہ تخلیق کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں، جو بانت سعاد کے نام سے شہرت آفاقی کا حقدار ہوا اور جسے سماعت فرما کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ انبساط کے جلو میں انہیں اپنی ردائے منزہ سے نوازا اور جس کا ایک شعر یوں ہے۔

إِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ مُهَنَّدٌ مِنْ سُيُوفِ اللهِ مَسْلُولُ

ترجمہ:۔ بیشک اللہ کے رسول البتہ نور ہیں، روشنی حاصل کی جاتی ہے ان کی ذات سے سیف قاطع ہیں اللہ کی سونتی ہوئی تلواروں سے۔

اسی طرح امام محمد بن سعید شمس الدین بوصیریؒ ایک ایسا دلآویز قصیدہ سپرد قلم کرتے ہیں جو اس روایت کے حوالے سے دنیائے ادب میں "قصیدہ بردہ" کے نام سے موسوم ہوا کہ بوصیریؒ نے عالمِ خواب میں اسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں پیش کیا۔ اور انہوں نے ان پر اپنی ردائے ہمایوں ڈال کر اپنی اس خوشنودی و مقبولیت کا اظہار فرمایا، جس کے فیضان سے بوصیریؒ نے اپنی جانکاہ علالت سے رہائی پائی اور جس کے دو روح پرور شعر یوں ہیں۔

(۱) وَكُلُّ آيٍ أَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا فَإِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُورِهِ بِهِمِ

ترجمہ:۔ جتنے معجزات اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسولوں نے پیش کیے، بیشک انہیں یہ نعمت حضورؐ کے نور سے ارزانی ہوئی۔

(۲) فَإِنَّهُ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا يُظْهِرْنَ أَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

ترجمہ:۔ بیشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم فضیلت و بزرگی کے مہرِ عالم تاب ہیں اور سارے انبیاء اس آفتاب کے ستارے ہیں، جو اندھیروں میں لوگوں کے لیے اپنے انوار کو ظاہر کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے قصیدہ "الطیب النغم" (بائیہ) میں اسی درخشاں صداقت کو ایک منزہ و تابندہ شعر میں یوں پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

وَأَشْهَدُ أَنَّكَ أَعْلَى الْمُرْسَلِينَ مَكَانَةً وَأَنْتَ لَهُمْ شَمْسٌ وَهُمْ كَالثَّوَاقِبِ

ترجمہ:۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ کا مرتبہ تمام رسولوں سے واضح و اعلیٰ ہے اور آپؐ کی ذات ان کے لیے آفتاب ہے اور وہ ستاروں کی مانند ہیں۔

اُردو نعت اپنے آغاز اور فروغ و ارتقاء کے لیے عربی بالخصوص فارسی نعت کی مرہونِ منت ہے۔ اور اس سلسلے میں مذکورہ نابغوں کے اثرات بڑے گھمبیر اور دوررس ہیں۔ اور شیخ سعدیؒ کا یہ نعتیہ شعر

حسنِ یوسف، دمِ عیسےٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

اہلِ ذوق کی کتنی بڑی تعداد سے بے محابہ ستائش کا حقدار بن چکا ہے، اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے اور ان کے یہ لطیف نعتیہ پیکر

بلغ العلےٰ بکمالہ
کشف الدجےٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ و آلہ

ہر چند کہ عربی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں تاہم فارسی اور اردو کی حدودِ اقتدار میں اپنی مقبولیت کی لامحدودیت میں اپنا مثیل نہیں رکھتے۔ اسی طرح امیر خسرو کے یہ نعتیہ اشعار

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سُو رقص بسمل بود شب جائے کہ من بودم
عدا خود میر مجلس بود اندر لا مکاں خسرو!
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

تو ہمیں اپنی کیف آوری کے تسلسل کا ادراک آج بھی ان پاکیزہ محفلوں سے بخوبی کرواتے ہیں۔ جو نعت درود اور سلام کے لیے خصوصی طور پر منعقد کی جاتی ہیں، پھر مولانا جامی کی وہ نعتیہ غزل، جو یوں طلوع ہوتی ہے

لی حبیبٌ ، عربیٌ، مدنیٌ، قرشیٌ
کہ بود درد و غمش مایۂ شادی و خوشی

اپنی پذیرائی کے اعتبار سے لائقِ ہزار رشک مقام پر استادہ ہے اور حضرت قدسی کی وہ آفاق گیر شہرت رکھنے والی نعتیہ غزل، جس کا دل پذیر مطلع یوں ہے

مرحبا سیّد مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

تو جتنے صاحبانِ فکر و نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے، ان کا شمار واقعتاً محال ہے اور یہ سعادت تو غالباً صرف اسی نعت کے حصہ میں آئی ہے کہ اردو اور فارسی کے سینکڑوں شاعروں نے اس کے اشعار کی تضمین کی اور یوں اس مقبولیت کی بیکرانی پر عملاً مہر تصدیق ثبت کی۔

یُوں تو اردو کے بیشتر کلاسیکی شعراء نے نعت گوئی کی سعادت حاصل کی مگر اس ضمن میں جنہیں قبول و نفوذ نصیب ہوا، ان میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے اسمائے گرامی نسبتاً زیادہ اہم ہیں۔ محسن کاکوروی کے "قصیدہ لامیہ" کو تو ہم اس اعتبار سے اردو کے بہترین قصائد میں سے ایک قرار دے سکتے ہیں کہ اس نے اپنی جدت طرازی سے اردو نعت کو ایک ایسے نئے موڑ سے آشنا کر دیا، جو زبان اور ماحول کے اعتبار سے علاقائی حوالہ رکھتا ہے اور اردو نعت کو عقیدت کے جلو میں جذبے کی سطح پر استوار کر کے اسے محبت کے والہانہ پن کا مظہر بناتا ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل!
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل

واضح رہے کہ اس جمالیاتی اسلوب کے اولین سرچشمہ کا سراغ کعب بن زبیرؓ کے اسی نعتیہ قصیدے میں ملتا ہے۔ جس کا تذکرہ آغازِ گفتگو میں کیا گیا ہے اور جس کی تشبیب میں کعب بن زہیرؓ نے اپنی محبوبہ سعاد کی زیبائیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور آنحضورؐ نے جس پر اپنے عدم تعرض سے نعت میں ایسے اسلوب رعنا کو بروئے کار لانے کا جواز ارزانی فرمایا ہے، مگر یہاں اس امر کی طرف تاکیدی اشارہ کرنا بے حد ناگزیر ہے کہ کہ آنحضورؐ کا یہ فراخدلانہ، عالی ظرفانہ اور جمال دوست طرزِ عمل ہمارے لیے ایسے طریق کار کی اجازت مرحمت نہیں کرتا کہ ہم نعت کہتے ہوئے حدودِ آداب سے سرمو تجاوز کر جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ نعت کی تخلیق کو بالکل بجا انداز میں تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہ محبت اور احترام کے دلآویز سنگم پر ظہور میں آتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سنگم کی تشکیل غیر معمولی دل و دماغ کے غیر معمولی اشتراکِ عمل کا ایک ایسا تقاضا کرتی ہے جس کی تکمیل جوئے شیر لانے سے کسی طور کم نہیں!

محسن کاکوروی کے بعد مولانا حالی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کا نعتیہ کلام دراصل اردو نعت میں جدیدیت کا در وا کرتا ہے۔ اگر قدیم نعتیہ شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس نے نعت کے لغوی معنیٰ مفہوم کو، جو مدح، ثنا، تعریف اور توصیف پر اپنی تمام تر فکری و جذباتی جامعیت کے ساتھ محیط تھا، بحیثیتِ مجموعی یوں تحدید آشنا کر دیا کہ نعت آنحضورؐ کے بمثال سراپے، ان کے حلیۂ اقدس اور ان کے تحیر خیز معجزات کے عقیدت آگیں بیان سے وابستہ ہو گئی اور آنحضورؐ کی عظیم ترین شخصیت کے وہ پہلو، اس میں اپنا بھرپور اظہار نہ پا سکے۔ جو نعت کے لوازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے آنحضورؐ کی ہمہ گیر ہستی ایک طرف عرفانِ خداوندی کا موجب بنتی ہے، دوسری طرف معرفت کائنات کا سبب ٹھہرتی ہے اور تیسری طرف شعورِ ذات کا وسیلہ قرار پاتی ہے۔ گویا ہماری کلاسیکی نعت نے آنحضورؐ کی سیرت کے مقابلے میں صورت پر اپنی توجہ نسبتاً زیادہ مرکوز رکھی۔ اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ نعت ارادت اور احترام کا دلآویز مظہر بن کر تو ابھری اور اس میں شبہ نہیں کہ اس حوالے سے اس نے ہمیں

یا صاحب الجمال ویا سیّد البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(شاہ عبدالعزیز دھلوی)

جیسے نادر قطعے اور

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

(اسد اللہ خاں غالب)

جیسے بے مثال شعر ارزانی کئے، مگر اس رویہ نے اس دوگونہ حقیقت کو جنم بھی دیا کہ نعت اگر ایک طرف جذباتی آمیختگی emotional involvement کی متوقع سطح کے حصول میں ایک مخصوص قسم کے ضعف کی آئینہ دار بن گئی اور یوں تخلیقی فن کے حوالے سے اس کا مقام متاثر ہوا تو دوسری طرف وہ آنحضورؐ کی شخصیت کی ان معنوی عظمتوں کو احاطہ کرنے میں مستعد نہ ہو سکی جو انفس و آفاق کے اعتبار سے لامحدود اہمیت اور نہایت قدر و منزلت رکھتی ہے کیونکہ یہی وہ عناصر ہیں جو آنحضورؐ کی شخصیت کو ایسی لاعصریت (timelessness) عطا کرتے ہیں جو ہر عہد میں اس کے مخصوص تقاضوں کی تعیین و تفہیم کر کے، اپنے آپ کو یوں نمایاں کرتی ہے کہ اسمیں عصریت (temporality) آجاتی ہے جسے روح عصر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جدید نعت نے روایتی نعت کو اس کی مذکورہ تحدید سے آزاد کر کے ایک مجتہدانہ اقدام کیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید نعت، جہاں آنحضورؐ سے جذباتی اور احساساتی تحریک کا فیضان حاصل کر کے اپنی فنی سطح کو ارفع تر بناتی ہے اور اس کی تخلیقی گرفت کو مضبوط تر بناتی ہے، وہاں آنحضورؐ کی سیرت کے پیکر زریں سے اکتساب نور کرتی ہے اور ان کے کردار کے گوناگوں اوصاف حمیدہ سے، اور عمرانی حوالے سے ان کے افعال و اعمال کی نوعیت و وقعت کا ادراک کر کے آشوب ذات اور آشوب کائنات پر قابو پانے اور ان کا مؤثر سدباب کرنے کے طریقے نہ صرف خود سوجھتی ہے بلکہ دوسروں کو بھی سمجھاتی ہے اور یوں وہ انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر فروغ و ارتقاء کی راہیں کھول کر شخصی، قومی، ملی اور بالآخر انسانی نشوونما ارتقاء کے امکانات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرنے میں گراں قدر معاونت کرتی ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ جدید نعت نے آنحضورؐ کے حوالے سے حق کی بے خوف حمایت، شر کے خلاف بے مفاہمت جہاد کے دوران میں صبر و استقامت کا اٹوٹ مظاہرہ، رنگ اور نسل کے بتوں پر حوصلہ مندانہ تیر زنی، غلامی، استعمار اور استبداد کے ہر خفی و جلی روپ سے نبرد آزمائی اور آزادی، حریت اور انسانی مساوات کی ترویج و اشاعت کے لیے انقلاب آفرین جدوجہد کو اپنے عظیم موضوعات کے طور پر کیسے اپنایا کیونکہ وہ ہمارے عہد غلامی کے ابتلا کی غمگسارانہ عکاسی پر بھی قادر ہوئی۔ اور کیونکر اس نے ہماری قومی شناخت کا بے نظیر فریضہ سرانجام دے کر ہمیں نہ صرف بیرونی سامراج سے طویل خونچکاں آویزش کی بدولت ایک آزاد مملکت کے حصول کے قابل بنایا بلکہ کرۂ ارض کی تمام محکوم و مجبور اقوام کو رستگاری اور خود مختاری کی راہ دکھانے میں بھی بالواسطہ طور پر گراں قدر کردار انجام دیا ہے۔

جدید نعت کے اولین ظہور کے ایک نمونہ کے طور پر مولانا حالی کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ اور قومی آشوب کے دل گداز اظہار سے نعت کے مفہوم کی توسیع کا اندازہ کیجئے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

اسی طرح علامہ اقبال کی جدید نعتیہ لے میں ارتفاعِ ذات اور فروغِ کائنات کے اس زیر و بم کا قیاس کیجیے، جو فکر و جذبہ کی ہم آہنگی سے منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

اب جدید نعت کے ایک اور بڑے علمبردار مولانا ظفر علی خاں کی معروف نعت کے ضیا پاش، توحید آگیں اور حریت پسندانہ لب و لہجہ سے حظ اٹھائیے۔ وہ کہتے ہیں۔

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں،
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
رحمت کی گھٹائیں پھیل گئیں افلاک کے گنبد گنبد پر
وحدت کی تجلی کوند گئی آفاق کے سینہ زاروں میں
ہم حق کے علمبرداروں کا ہے اب بھی نرالا ٹھاٹھ وہی
بادل کی گرج بجیروں میں، بجلی کی تڑپ تلواروں میں

مولانا حالیؔ، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ جن فنکاروں نے اپنے منفرد اسلوب میں اردو نعت کے

جدید رنگ روپ کو نکھارا سنوارا، ان میں مولانا حسرت موہانی، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، احسان دانش اصغر گونڈوی جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، روش صدیقی، بیدم وارثی، امجد حیدر آبادی اثر صہبائی۔ اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر سید صفدر حسین، مولانا ماہر القادری، مولانا نعیم صدیقی، حافظ مظہر الدین، عبدالکریم ثمر، آذر عسکری، محشر رسول نگری، منظور حسین شور، اقبال عظیم، یوسف ظفر، قیوم نظر، ظہیر کاشمیری ادا جعفری، شیر افضل جعفری، سجاد باقر رضوی، فارغ بخاری، خاطر غزنوی، محسن احسان، رضا ہمدانی، قتیل شفائی۔ جمیل ملک، ظہور نظر، جعفر طاہر، حمایت علی شاعر، احمد شمیم، احمد ظفر، افضل پرویز، طفیل ہوشیارپوری۔ انجم رومانی، شہرت بخاری، سید فیضی، سراج الدین ظفر، تبسم رضوانی، توصیف تبسم، سرمد مظاہری، ساغر صدیقی، راسخ عرفانی، اختر انصاری اکبرآبادی، مجیب خیرآبادی، فضل حق، طفیل دارا، محمد اعظم چشتی، خالد بزمی، راز کاشمیری، راجا رشید محمود، شبنم رومانی، امین طارق قاسمی، انوار ظہوری، علیم ناصری، حافظ امرتسری، عابد نظامی، رفعت سلطان، جیلانی کامران، مرزا محمد منور، غلام رسول ازہر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، طاہر شادانی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

نعت کے ایک نئے روپ کی ایک نظر افروز جھلک دیکھنے کی غرض سے مولانا نعیم صدیقی کی ایک نعت کے چند اشعار کا مطالعہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں

دلوں کو رکھی ہے چاہ تیری، غموں کے گلشن سجا سجا کے
شبوں کو دیکھی ہے راہ تیری، دیئے پلک پر جلا جلا کے
تمام ذرّوں میں خاکِ رہ کے ہزاروں عالم مچل رہے ہیں
یہ علم و دانش، یہ تاج و سطوت ہیں معجزے تیرے نقش پا کے
خود آگہی کا سبق سکھایا، مقام انسانیت دلایا
غرور والوں کے سر جھکا کے، پسے ہوؤں کو اُٹھا اٹھا کے
دلائی پھر بندگی کی عظمت، بڑھائی پھر زندگی کی عزت
سجائی کیا محفلِ اخوت شہ و گدا کو گلے ملا کے
خود اپنے گھر میں تھا فقر و فاقہ، جہتوں ٹھنڈا رہا ہے چولھا
بھری زمانے کی تو نے جھولی، غنا کی دولت لٹا لٹا کے!

اب نعت کے آہنگ نو کا خوشگوار ذائقہ چکھنے کے لیے احمد ندیم قاسمی کی ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ وہ کہتے ہیں۔

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا
پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم

مجھ کو جھکنے نہیں دیتا یہ سہارا تیرا
شرق اور غرب میں بکھرے ہوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا
اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا
تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا

اب عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی سے کیف و نور کا اکتساب کیجئے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہمہ آیۂ نور و خلقِ مجسم
تو محبوبِ یزداں و نورِ ہدا ہے
تو فقر و قناعت کا روشن منارہ
محمدؐ ہے، احمدؐ ہے، تو مصطفیٰؐ ہے
تو دلجوئی و غم گساری کا پیکر
تو خیر البشر، اشرف انبیاء ہے
رہِ حق ہیں رہتا ہے پیہم تو ساعی
حقوقِ قرابت کو پہچانتا ہے
اولوالعزم، عالی ہمم، خانِ عالم
تو ختم الرسل، خاتم الانبیاء ہے

اور اب عابد نظامی کی اس نعت کے چند اشعار مطالعہ کیجئے جو ملی آشوب کی دردمندانہ ترسیل اور اپنے استمدادی لہجے کے حوالے سے ایک نہایت موثر فن پارہ کہلانے کی مستحق ہے اور جس کے فکر و جذباتی ڈنڈے مولانا حالی کی مسدس سے ملتے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

خلق کو خالقِ اکبر سے ملانے والے،
حق کا پیغام زمانے کو سنانے والے!
آج امت کی بھی سوئی ہوئی تقدیر جگا،
کرۂ ارض کی تقدیر جگانے والے!
نام لیوا تیرے محتاج ہوئے غیروں کے،
علم و تہذیب زمانے کو سکھانے والے!

کتنے ہی مکوں میں محکوم ہیں تیرے شیدا،
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑانے والے!
تیری اُمت نہ ہو دنیا میں کسی کی محتاج،
فخرِ کونین اے رحمت کے خزانے والے!

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان نمونوں میں فنکاروں کی ساری توجہ آنحضورؐ کی سیرت پر مرکوز ہے اور وہ ان کے کردار کی تحسین کے حوالے سے خود شناسی، کائنات شناسی اور خدا شناسی کے مراحل طے کرنے میں کوشاں ہیں۔

میں نے اسوۂ حسنہ کے حوالے سے جدید نعت کی جس سہ گونہ عطا یعنی خود شناسی، کائنات شناسی اور خدا شناسی کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات مقدر (UNDERSTOOD) ہو جاتی ہے کہ جدید نعت ایک ایسی منفرد نوعیت کی تخلیق کا ارفع مقام حاصل کر گئی ہے۔ جس کے ظہور کے لیے اس کے خالق کا حلقہ بگوش اسلام ہونا لازمی شرط کی حیثیت نہیں رکھتا۔ جس شخصیت کی عظمت کے بارے میں قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہے[1]۔ اور جو خود اپنے منصب جلیلہ کا تعین کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اسے اخلاق حسنہ کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے[2]۔ اس کے کردار کے اثر و نفوذ کا دائرہ کیوں کر صرف ان فنکاروں تک محدود رہ سکتا تھا جو اصطلاحی معنوں میں اس پر ایمان لائے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی بے مثال ہستی کی بے مثالیت کا ناگزیر تقاضا تھا کہ اس کا قبول و تاثر عالمگیر ہوتا اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی گہرائی ہی میں اضافہ نہ ہوتا بلکہ اس کی گیرائی بھی فزوں تر ہوتی اور یہ بات پوری انسانیت کے لیے باعث افتخار ہے کہ عہدِ نو میں یہ ناگزیر تقاضا بطریق احسن پورا ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید اُردو نعت کے سرمائے میں توسیع کا اعزاز ان شعراء کو بھی حاصل ہوا جنہیں معروف ایمانی مفہوم کے مطابق وابستگان رسولؐ میں کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں دتو رام کوثری سے قطع نظر کہ وہ مدح پیمبر کرتے کرتے اور اس دوران میں آنحضورؐ کی سیرت کی معنوی تہوں سے آشنائی حاصل کرتے ہوئے بالآخر دائرۂ دین میں علانیہ داخل ہو گئے تھے[3] پنڈت ہری چند اختر، رگھوپتی سہائے فراق، گورکھ پوری، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد بالمکند عرش ملسیانی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، مہاراج کشن پرشاد شاد، اور منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے

---

[1] "انک لعلیٰ خلق عظیم" (بیشک آپؐ اعلیٰ اخلاق کے عظیم مرتبہ پر ہیں)
سورۃ القلم ۶۸ : ۴

[2] "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" (میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں) (موطا)

[3] ان کا اسلامی نام کوثر علی کوثری تجویز ہوا۔ (عارف)

نام اہم ہیں۔ آنحضورؐ کی سیرت کے سلسلے میں ان شعراء کو حدود فہم کا اندازہ کروانے کے لیے صرف پنڈت ہری چند اختر اور جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کو نمونہ کے طور پر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، اول الذکر کہتے ہیں۔

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
کس نے ذرّوں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا درِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

اور مؤخر الذکر رقم طراز ہیں:۔

حقیقت کی خبر دینے بشیر آیا، نذیر آیا
شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے، وہ فقیر آیا
بھٹکتی خلق کو رستہ دکھانے رہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا
خلیق آیا، کریم آیا، رؤف آیا، رحیم آیا
کہا قرآن نے جس کو صاحبِ خلقِ عظیم آیا
سراپا علم بن کر صاحبِ ام الکتاب آیا
زمینِ تشنہ لب کی زندگی بن کر سحاب آیا

نئی نسل نے نعت نگاری کی طرف بالخصوص توجہ مبذول کی ہے اور اس کی جمیل کوششوں سے نعت روح عصر کی ایک انتہائی اہم نمائندہ بن کر ہمارے ادب میں غیر معمولی قدر و منزلت کی حامل ہو گئی ہے۔ نئی نسل میں جن فنکاروں کی نعتیہ عطائیں نسبتاً زیادہ وقیع ہیں، ان میں حفیظ تائب، منیر نیازی، مظفر وارثی، رضی ترمذی، حافظ لدھیانوی، بشیر منذر، اقبال صلاح الدین، صلاح الدین محمود، عرش صدیقی، صلاح الدین ندیم، عبدالشکور بیدل، کامل القادری، محمد افضل فقیر، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، کشور ناہید، عطاء الحق قاسمی، اختر امان، خالد احمد، نجیب احمد، پروین شاکر، ناہید قاسمی، سیف زلفی، اقبال ساجد، اظہر جاوید، طاہر تونسوی، الطاف قریشی، عبدالستار سید، اظہر نفیس، صہبا اختر، سلطان رشک، حسن رضوی، حفیظ صدیقی، حفیظ احسن، زاہدہ صدیقی، رشید کامل، واصف علی واصف، رشید قیصرانی، ظہیر صدیقی، نعیم اظہر، یوسف مثالی، خالد شفیق، حامد حسن حامد، تحسین فراقی، یونس احقر، شاہد واسطی، خالد جذبی، جاں کاتبیری، سرفراز عامر اور محمد نواز کے نام سرِ فہرست آتے ہیں۔

نئی نسل کی نعتیہ کاوشوں کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

سرچشمۂ اقدارِ منور تری سیرت
سرنامۂ پیشانیِ خاور تری سیرت
زیبائیِ افکار کا مصدر تری گفتار
رعنائیِ کردار کا جوہر تری سیرت
تخلیق کے چہرے کی ضیا ہے تری ہستی
تہذیب کے ماتھے کا ہے جھومر تری سیرت
ہر راہ پہ مرا ہاتھ لیے ہاتھ میں اپنے
چلتی ہے مرے ساتھ برابر تری سیرت

حفیظ تائب

مجھ کو بھی اس زمین پہ معراج بخش دے
توفیق دے کہ خود کو ترا نقشِ پا کہوں
میدانِ زندگی میں میرے ہاتھ شل نہ ہوں
حق بات دل میں ہو تو کہوں، برملا کہوں
پھر خاکداں کو تیری ضرورت ہے لوٹ آ
یہ بات کس سے دہر میں تیرے سوا کہوں
شہزاد مانگتا ہے دُعا سب کے واسطے
کس طرح اپنی ذات کو سب سے جدا کہوں

شہزاد احمد

میرے احساس کے دریا میں روانی تجھ سے،
اے گلِ جاں، مرے ہونے کی نشانی تجھ سے!
موسمِ گل بھی ترا، فصلِ خزاں بھی تیری،
میری آواز کے صحراؤں میں پانی تجھ سے!
تجھ ہی سے میری تمناؤں نے وسعت پائی،
آنکھ کے رنگ سماعت کے معانی تجھ سے!

امجد اسلام امجد

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیت لکھی
سرحدِ رنگ بہ عنوانِ اخوت ڈھائی
ورقِ دہر پہ ہر سطرِ محبت لکھی
تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اِک بحر کی وسعت لکھی
تیرے اوصاف فقط تجھ سے بیاں ہوتے ہیں
نعت خود لکھی، بہ پیرایہ سیرت لکھی

خالد احمد

نعت ایک طویل عرصے تک اپنے اظہار کے لیے قصیدے یا غزل کا مروجہ پیٹرن بروئے کار لاتی رہی ہے مگر گذشتہ چند برسوں میں جدید نعت نے فارم کے اعتبار سے آزاد نظم کو اپنا کر اس حقیقت پر بھی مہر تصدیق ثبت کی ہے کہ نئے افکار کی ترسیل کے لیے بسا اوقات نئی ہیئت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان آزاد نعتیہ نظموں میں نئی شاعری کے اسی آب دار عنصر کا بالخصوص لحاظ رکھا گیا جو ایمائیت سے عبارت ہے اور جو ماضی الضمیر کے اظہار کے لیے علائم و رموز کو بروئے کار لانے کا قائل ہے اس علامتی طرز ابلاغ نے جدید نعت کو ایک ایسی تہہ داری سے ہمکنار کیا ہے جس نے اسے نہ صرف مزید عمق فراہم کیا ہے بلکہ اس کو ایک انفرادی آن بان بھی ارزانی کی ہے۔ میری منکسرانہ رائے میں جدید نعت کا یہ مخصوص و منفرد روپ مستقبل میں مستحکم تر بنیادوں پر استوار ہو گا۔ اور اس کے نئے نقش کی تعیین میں اہم کردار ادا کرے گا۔ کیونکہ نئے ادب کے ان خالقین اور قارئین کے لیے اس میں زیادہ کشش ہے جس کی تربیت بنیادی طور پر آزاد علامتی نظم کے ماحول میں ہوئی ہے۔

رشید قیصرانی کی مندرجہ ذیل نعتیہ نظم کو آزاد علامتی نعت کی ایک خوبصورت مثال کے طور پیش کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، وہ کہتے ہیں:

اک دیپ جلا اندھیاروں سے،
ظلمت کے بپھرے سینوں سے،
اِک چیخ اُٹھی،
اِک شور مچا،
یہ روپ سروپ اندھیاروں کا،
برسوں سے قائم دائم ہے،

یہ کس کی جسارت ؟
کس کا دم ؟
یہ کون ہماری نگری میں،
ظلمات کا دم یوں نوچتا ہے ؟
صدیوں کی سوئی دھرتی پر،
یہ کون اجالے پھینکتے ہیں ؟
بے خوف و خطر
چپکے چپکے
وہ دیپ مگر جلتا ہی رہا
یہ دیکھ کے ظلمت گاہوں سے،
کچھ زہر بھرے اژدر نکلے،
کچھ سانپ سنپولے در آئے،
کچھ تند ہوائیں چیخ اٹھیں،
کچھ تیز بگولے لہرائے،
ظلمات کی ساری سینائیں،
اک تنہا دیپ پہ ٹوٹ پڑیں!
اتنے میں کچھ پروانوں نے
اس دیپ پہ گھیرا ڈال لیا،
یہ پروانے لاچار بھی تھے،
کمزور نحیف و نزار بھی تھے،
پر دیپ کی رکھشا کی خاطر،
وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر،
طوفان کے منہ میں کود پڑے،
کچھ پار گئے
کچھ ڈوب گئے،
یلغار سے پروانوں کی مگر،
طوفان کے چھکے چھوٹ گئے،

اتنے میں کچھ بیراگی جی،
قندیل جلانے آ پہنچے،
وہ دیپ جو تنہا جلتا تھا
اس دیپ سے لاکھوں دیپ جلے،
طوفان کا سینہ چاک ہوا
دم ٹوٹ گیا اندھیاروں کا!

شعراء کی نئی نسل کو علامہ اقبالؒ کے اس لطیف ترین نکتہ کا نہ صرف فہم میسّر آچکا ہے بلکہ اس نے اپنے فن کے ذریعے اس کی عملی تفسیر بھی پیش کرنے کا تہیہ کر لیا ہے جسے انہوں نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے:

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

انتخاب

میں اپنی ذات کا غارِ حرا کروں تعمیر
بصد نیاز و عقیدت وہاں بلاؤں تجھے

مرادِ قلب بھی تُو ہو، مری پناہ بھی تُو!
مَیں خود زمین بنوں، آسماں بناؤں تجھے

یہ اور بات کہ مل جائے تیری صُحبت بھی
بہت ہے، میرے لیے ورنہ تیری حسرت بھی

ترے حوالے سے اظہار اپنا کرتا ہُوں
تو میری رُوح کی پہچان بھی ہے نسبت بھی!

تھے ایک وہ بھی کہ جو دیکھتے رہے برسوں
نماز تیری، دُعائیں تری، وضو تیرا!

ہیں ایک ہم بھی کہ اک عمر ہونے آئی ہے
سُراغ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کُو بہ کُو تیرا!

میں اپنی نعت کو اظہارِ فن قرار نہ دُوں
میں اس کو عرضِ تمنّا کا اِک بہانہ کہُوں!

ترے رشتوں کی نہایت ہیں ازل اور ابد
میں ہر اک عہد میں جیتا ہوں حوالے سے ترے!

بار گیتی تو اُٹھا رکھا ہے پر تیرے حضُور
آنکھ اُٹھائی نہیں جاتی ہے جیالے سے ترے!

ترے سُراغ سے مجھ کو مرا نشان ملے
تجھے تلاش کروں، اپنی جستجو نہ کروں!

مجھے قبول نہ ہوں دو جہاں بھی تیرے عوض
بجز ترے میں کسی شے کی آرزُو نہ کروں!

میں کس طرح ترے اوصاف کا شمار کروں
خدا کے بعد محاسن ہیں بے عدد تیرے!

تری حدیث میں مضمر ہے اعتبارِ سخن ،
مرے لیے تو سبھی لفظ ہیں سند تیرے!

یوں تو صدیوں کی مسافت ہے، ہمارے درمیان
تو ہے نزدیکِ رگِ جاں، مجھ کو ہوتا ہے گماں!

تجھ کو دوگونہ سفارت کا شرف تفویض ہے
تو خدا کا ہی نہیں، انساں کا بھی ہے ترجماں!

خوشی کی پہچان بخش مجھ کو، غموں کا عرفاں مجھے عطا کر
میں تیری دہلیز پر کھڑا ہوں مجھے مری ذات سے سوا کر!

مجھے فلک کی سی سرکشی دے مجھے زمیں کی سی عاجزی دے
جہاں سے گزروں تو سر اُٹھا کر، تجھے ملوں میں تو سر جھکا کر!

زندگی میری ہے طائف کے سفر کا پر تو !
میں نے پائی ہے ستم سہنے کی قوت تجھ سے!

ایک ہم ہیں کہ ترستے ہیں تصوّر کو ترے!
ایک وہ تھے جنھیں بخشی گئی صحبت تجھ سے!

نہ مجھ کو جاہ و حشم کی خواہش، نہ مال و زر میرا مسئلہ ہے
خدا کے آگے سدا رہے گا مرے لبوں پر سوال تیرا!

اگرچہ میرا پیار تجھ سے مگر لصبر ننگ چھینتا ہوں!
میں جب تصوّر میں دیکھتا ہوں، اویس تیرا، بلالؓ تیرا

مرحلے تیز سفر کے تھے ازل اور ابد !
جادۂ وقت سے آگے ترا جادہ دیکھا!

دہر نے تجھ کو شگفتہ بھی، غمیں بھی پایا !
تیرے چہرے پہ گلاب، آنکھوں میں تارا دیکھا!

سرو قد دیکھے ہیں تاریخ نے لاکھوں لیکن
قد کسی کا بھی ترے قد سے نہ اونچا دیکھا!

سانچے میں اپنے تو مرا کردار ڈھال دے
ہو جاؤں لازوال مجھے وہ کمال دے!

محنت سے پیار کرتا رہوں میں تری طرح
ہاتھوں میں میرے اپنی چمکتی کدال دے!

مجھ کو بھی جبر سہنے کی توفیق کر عطا
مجھ کو بھی استقامتِ روحِ بلالؓ دے!

آئینے کی طرح تجھ کو دیکھ کر مجھ پہ کھُلے
میرے خدوخال کیسے ہیں، میں کیا ہوں، کون ہوں!

تیری رحمت اک سمندر کی طرح مجھ کو ملے
اور اس کو بکسیوں میں قطرہ قطرہ بانٹ دوں!

ترے ہی نام کی خوشبو ہے اس کے گھر گھر میں
مرا دیار لگے ہے تیرا دیار مجھے!

میں تیری راہ کا پتھر ہوں، گرد گرد ہوں میں
تو آئینے کی جلا دے کبھی نکھار مجھے!

مری طلب ہے یہی تیری بیکرانی سے
کہ آبجو ہوں، بنا بحرِ بے کنار مجھے!

سارا عالم تری خوشبو سے مہک اُٹھا ہے
عُود کی طرح سدا خود کو جلایا تو نے!

فقر کو رفعتِ مفہوم ترے گھر سے ملی
اپنے دروازے پہ شاہوں کو جھکایا تو نے!

حدیثِ تیری عمل کا منشور بن کے ہر عہد میں عیاں ہو
ترے حوالے سے ہر زمانے میں اک نیا انقلاب دیکھوں!

کی حرف حرف جس کی تلاوت تمام عمر
تو میرے واسطے وہ مقدّس کتاب تھا!

میرا دماغ اٹھاتا رہا اَن گنت سوال
تیرا وجود اُن کا مکمل جواب تھا!

سُن سُن کے جس کو کروٹیں لیتا رہا جہاں
تیرا ہر اک سخن جرسِ انقلاب تھا!

تجھ کو اسرارِ جہاں سے آشنا پاتا ہوں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں خود کو، دے مجھے میری خبر!

ابنِ آدم کے غموں نے مجھ کو بخشا تیرا کھوج
دردِ دل میں عکس تیرا، کربِ جاں میں تیرا گھر!

نہ تو کتاب، نہ تو صاحبِ کتاب مگر!
بجا ہے تجھ کو اگر حاصلِ کتاب کہیں!

کھُلتے ہیں اور کھلتے نہیں بھی جو ذہن پر
اس دہرِ بے جہت کے وہ اسرار آپ ہیں

ہر بار جس سے پائے زباں ذائقہ نیا
اس حرفِ دلنواز کی تکرار آپ ہیں

ازل سے ہوں میں سفر میں، ابد مری منزل
ہر ایک مرحلہ میرا ہے نارسا تجھ بن!

بجا کہ حشر کے دن ہے وصال کی اُمید
مگر یہ حشر کہ ہے رُوح میں بپا تجھ بن!

میں بھی وقفِ ابتلا شعبِ ابی طالب میں ہوں
فتحِ مکّہ کی بشارت مجھ کو بھی تو کر عطا!

سر کٹانے کا مجھے بھی حوصلہ تفویض کر!
میں نہیں ابنِ علیؓ لیکن جہاں ہے کربلا!

تو بے مثال ہے آیا نہ آئے گا تجھ سا!
کہ لائے گا نہ خدائی میں خود خدا تجھ سا!

کہاں کہاں تری رحمت کے نقش ثبت نہیں
یہ بحر تیرا، یہ صحرا ترا، یہ بن تیرا!

ترے حوالے سے آفاقیت ملی مجھ کو
تو ہر وطن کا ہے، کوئی نہیں وطن تیرا!

منکشف ہوتے ہیں اسرار حوالے سے ترے
تو اُترتا ہے خیالوں میں خبر کی صورت!

تیرے اخلاص نے بخشا ہے اُسے حسنِ قبول — ہر دُعا میں تو سمایا ہے اثر کی صورت!

تجھ سے منسوب ہے اعزاز کی ہر اک صورت — تیری نسبت سے ہر اک شخص نے عزت پائی!

زمہریر اپنے رگ و پے میں اُتر آیا تھا! — تو کہ سورج ہے ترے دم سے حرارت پائی!

تجھ کو فاران کی چوٹی سے مخاطب پا کر — میں نے سو رنگ سے اظہار کی جرأت پائی!

میں ترے ساتھ ہوں اور تو ہے مرے ساتھ حبیبؐ — مگر تو چاند ہے اور میں اندھیری رات حبیبؐ!

تڑپ رہا ہوں ترا ہاتھ تھامنے کے لیے — کہ تیرا ہاتھ ہے مجھ کو خدا کا ہات حبیبؐ!

تجھ سے دھیان ہٹتے ہی شاہ رگ لگے کٹنے — تیرا نام لیتے ہی سر سے موت ٹل جائے!

مرے قلب و نظر کو وسعتِ بعید عطا کر دے — کہ تیری عظمتوں کا کچھ تو کر پاؤں میں اندازہ!

نجانے کس گھڑی تیرا کرم تجھ کو اِدھر لائے — کھلا رکھتا ہوں میں ہر وقت اپنے دِل کا دروازہ!

دے آنکھ کہ دیکھوں ترے اوصافِ حمیدہ! — دے فہم کہ سمجھوں ترا پاکیزہ جریدہ!

حسرت ہے کہ تو پاس ہو اور بن کے میں حسّانؓ! — لکھوں بھی سناؤں بھی تجھے تیرا قصیدہ!

سیکھا ہے قُلِ العفو سے انفاق کا یہ طور — جیب اپنی سدا رکھتے ہیں ہم آپ دریدہ!

تو رنگ ہے، خوشبو ہے، حلاوت ہے، نمو ہے — تو حسنِ چمن بن کے مری آنکھ میں لہرائے!

گہنائے نہ سورج تری رحمت کا ابد تک
تا حشر ترے پیار کا مہتاب نہ گہنائے!

جو عہد بھی آئے تری سیرت پہ ہو نازاں
جو دور بھی آئے ترے کردار پہ اترائے!

میرے رسولؐ میں ہر دم تری پناہ میں ہوں
زمیں پہ نظر آتا ہوں، مہر و ماہ میں ہوں!

تو شہر کے عرصۂ تیرہ میں خیر کا سالار
مجھے یہ فخر کہ میں بھی تری سپاہ میں ہوں!

دنوں کو سوتے ہیں ہم دھوپ اوڑھ کر لیکن،
حرا کے غار میں راتوں کو جاگتا ہے تو!

تری صفات مسافت ہیں ہم مسافر ہیں
کبھی جو ہو نہ سکا طے، وہ مرحلہ ہے تو!

دید کا شوق بھی رکھتا ہوں، جھجکتا بھی ہوں!
مجھ کو آداب سکھا، اِذن پذیرائی دے!

شہر میں گھوم رہا ہوں میں ترے چہرے سے
رنگ تھوڑا سا مجھے لالۂ صحرائی دے!

تو کہ رعنائی کردار کی معراج پہ ہے
مجھ کو بھی تھوڑی سی کردار کی رعنائی دے!

تو مرا راہنما بھی ہے، نگہبان بھی ہے
میرے ہونے کی شہادت بھی ہے، پہچان بھی ہے!

تیری دو گونہ شریعت وہ کرامت ہے کہ جو
تن کی تہذیب بھی ہے، صبح کا پیمان بھی ہے!

جس کا ورق ورق ہے ترے پیار کی حدیث
میں آدمی کے روپ میں ایسی کتاب ہوں!

ہر آن سوچتا ہوں میں تیرے فراق میں!
محشر میں ہوں کہ آپ ہی روزِ حساب ہوں!

حساب تجھ سے ہے روزِ حساب تجھ سے ہے
مرے گناہوں کو گویا حجاب تجھ سے ہے!

ہر ایک دَور کی تعلیم تجھ سے ہے منسوب
ہر ایک عہد میں رائج نصاب تجھ سے ہے!

ازل سے تا بہ ابد وقت ایک دریا ہے
اور اس میں موج ہے تجھ سے حباب تجھ سے ہے!

میں ایک عمر سے جس کے لیے ترستا ہوں
حرا کے غار نے دیکھا ہے وہ قیام تیرا!

لبوں پہ آئے تو تحسین سے رہے مشروط
تمام ناموں کا حاصل ہے ایک نام تیرا!

سُنا ہے جس نے وہی ہو گیا ہے گرویدہ
کہ اک کرشمۂ اظہار ہے کلام تیرا!

یہ کائنات کہ جو کہنگی میں تھی ملبوس
عطا ہوا اُسے اعزازِ تازگی تجھ سے!

سبھی سمجھتے ہیں قرآں کا ترجماں تجھ کو
کسے خبر کہ یہ قرآں ہے ترجماں تیرا!

میں جب بھی راہِ صداقت سے ہٹنے لگتا ہوں
خیال روکتا ہے مجھ کو ناگہاں تیرا!

جبرئیلؑ کے پر جہاں جلے تھے،
وہ تیرے سفر کا مرحلہ تھا!

قدرت کی کتاب کا تھا قاری
ہر چند کہ تُو نہیں تھا خواندہ!

افکار ترے فلک فلک تھے
سرخشتِ زمیں پہ گو دھرا تھا!

تخلیق سے پہلے ایک تجھ کو!
خالق نے نہ جانے کتنا سوچا!

میں تیری دید کی وسعت کا ہوں تمنائی !
جدھر بھی آنکھ اُٹھاؤں تُہی دکھائی دے !

میں جس سے لکھوں محاسن ترے کتاب کتاب
مرے لہو کو وہ اسلوبِ روشنائی دے !

زمانہ تیرے حوالے سے رُخ بدلتا ہے
ہر انقلاب کی جاں اِنقلاب تیرا ہے

ترے اک ہاتھ میں مُصحف تھی تو اک ہاتھ میں تیغ
میرا وجدان بھی مانگے ہے شجاعت تیری

تیری معراج میں ہے رمزِ عروجِ انساں
آدمیّت کی نہایت ہے شریعت تیری

اپنی خوشبو سے مری ذات کو پُرمایہ بنا
حُسنِ کردار کا پیمانہ ہے سیرت تیری

میں ناتواں ہوں مگر آپ میری قوت ہیں
میں جب بھی گرتا ہوں مجھ کو سنبھالتے ہیں آپؐ

جن لوگوں نے خوں میرا بہایا ہے سرِ راہ
میں اُن کے لیے تیری طرح حرفِ دُعا ہوں !

کیا غم جو بُرا ہوں میں زمانے کی نظر میں !
صد شکر اگر تیری نگاہوں میں بھلا ہوں !

بے بسی دیکھ کے مفلس کی پگھلتا جاؤں
دردمندی میں ترے دیدۂ تر سے مانگوں !

دُکھ کا سورج ہے سوا نیزے پہ دشتِ غم ہے
عافیت میں تری رحمت کے شجر سے مانگوں !

لے لیجے مجھ کو اپنی پناہِ بسیط میں !
میں آپؐ کی زمیں ہوں، مرے آسماں ہیں آپؐ

ہوں بزمِ دوستاں میں تو حرفِ سبک ہیں آپؐ
اور رزمِ دشمناں ہو تو کوہِ گراں ہیں آپؐ

ترے کرم پہ ہو مرکوز زندگی میری
ہٹے نہ دُور مری زیست اپنے محور سے!

لحد میں زندہ اتارا گیا نہ پھر اس کو
عذاب باپ کا ٹالا ہے تو نے دختر سے!

مرے لہو سے رہے اس کا سلسلہ قائم!
چلی تھی رسمِ شہادت رسُولؐ کے گھر سے!

طائف کا سفر طے نہ کیا، سنگ نہ کھائے!
ہم کب تری سُنّت پہ چلے، کوئی بتائے!

کب قریۂ ظلمت میں لہُو اپنا بہایا
کب رنگ ترے ہم نے رگِ جاں میں رچائے!

احرام کو کب ہم نے کفن اپنا بنایا
کب سوئے حرم گھر سے تری طرح نکل پائے!

دشمن ہی نہیں دوست بھی بیزارِ سخن ہیں
کب ہم کو سلیقے تری گفتار کے آئے!

مرے حبیبؐ بتا تو ہی اب کہاں جاؤں!
ملامتوں کا اک آشوب ہے جہاں جاؤں!

تو اپنی چادرِ رحمت سے ڈھانپ لے مجھ کو!
صلیب اپنی اُٹھائے کہاں کہاں جاؤں!

ہے مستقر مرا لاہور، طیبہ منزل ہے
یہ خاک چھوڑے تو میں سوئے آسماں جاؤں!

دیارِ پاک کبھی یوں بھی ہو کہ تیری طرف
جھجک جھجک کے بڑھوں اور کشاں کشاں جاؤں!

تو جو مل جائے تو ہر چیز مری ہو جائے
آسماں تیرا، زمیں تیری، زمانہ تیرا!

اور جتنے بھی سہارے ہیں سُبک کرتے ہیں
عزّتِ نفس بڑھاتا ہے سہارا تیرا!

تو کہ خورشیدِ ازل ہے، تیری رحمت کے طفیل ! شب کی رگ رگ میں ترا زور ہے اُجالا تیرا!
نعت اظہار کی ثروت کا نشاں ہے تجھ سے آبروئے حرف کی ہے صرف حوالہ تیرا!
ترے کرم کے تسلسل میں ہے نجات مری کہ میری زیست کا ہر لمحہ امتحانی ہے!
یہ اور بات کہ اس کی جڑیں زمین میں ہیں، ہر ایک قول تیرا ہفت آسمانی ہے!
ترا صحیفہ حقائق نگار ہے ورنہ -! ہر اک کتاب کم و بیش داستانی ہے!
مجھے ہو منزل کی فکر کیونکر کہ میں نے پایا ہے، رہبری کو وہ ایک انسان جو ہر زمانے میں رہبر بے بدل رہا ہے!
میں تیرے قدموں کی چاپ سنتا ہوں وادیِ مانوس دھڑکنوں میں، عجب سرودِ مسافرت ہے جو میرے سینے میں پل رہا ہے!
ازل ابد تیرے خوشہ چیں ہیں تو وقت ہے اور بیکراں ہے وہ شخص صدیوں پہ چھا گیا ہے جو تیرے ساتھ ایک پل رہا ہے!
زیست کی راہ پہ بے زادِ سفر چلتا ہوں ہر قدم تیرے کرم کی ہے ضرورت مجھ کو!
سخت شرمندہ ہوں عریانیِ خال و خد سے ڈھانپ لے کاش تری چادرِ رحمت مجھ کو!

میں کسی اور قیامت سے شناسا نہ رہا
تجھ سے دُوری نے دکھائی وہ قیامت مجھ کو!

عرش صدیقی

عارف عبدالمتین کی نعتیہ شاعری

عارف عبدالمتین کی زندگی صداقت کی جستجو میں خوب سے خوب تر کے حصول کی خاطر اختیار کئے گئے کامیاب سفر کی دل نواز داستان ہے۔ اوّل اوّل یہ سفر ایک ہمک، باطن سے اُٹھنے والی ایک تحریک اور ایک بنیادی طور پر اعلیٰ کردار کی حامل شخصیت کے فطری جذبے کا مظہر تھا جسے عارف نے اوائل عمر میں یقیناً اپنے مزاج، شخصیت کے غالب رجحان، گھر کے ماحول اور ابتدائی تربیت کے زیرِ اثر اختیار کیا تھا۔ پھر، سنِ شعور کو پہنچنے پر اسے معلوم ہوگیا کہ اس نے صداقت کا جو معیار اپنی ابتدائی تربیت اور باطن کے رُجحان کے زیرِ اثر قائم کیا تھا وہی معیار اوّل و آخر دائم و قائم رہنے والی قدر تھی۔ عارف ان لوگوں میں سے تھا جن کا شعور اوائل عمر ہی سے بیدار ہوتا ہے۔ اور جو ماضی میں دُور تک دیکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کا اندازہ لگانے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ عارف ایسے روشن دماغ شخص کی نظروں سے زندگی گزارنے کے متبادل اور بعض لحاظ سے بہت زیادہ پُرکشش راستے اوجھل نہیں رہ سکتے تھے۔ دیدۂ بینا اور ذہنِ بیدار رکھنے والے عارف نے ان راستوں کو چھوڑ کر صداقت کی جستجو کا دُشوار تر سفر یقیناً ایک مسعود جذبے کے زیرِ اثر اختیار کیا تھا لیکن وہ شروع ہی سے جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کی معنویت اور اصلیت کیا ہے۔

عقیدے اور یقین کو انسانی زندگی میں ہمیشہ سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے اور سائنس کی لامحدود ترقی کے باوجود اس اہمیت کا احساس قائم ہے۔ لیکن تاریخ میں ایسے بہت سے عقیدوں کا ذکر موجود ہے جو زندگی

کے نت نئے دریافت ہونے والے حقائق کے سامنے ٹھہر نہیں سکے۔ علم کی دنیا میں نئی نئی دریافتوں اور سائنس کی ترقی کے باعث ایک وقت ایسا آیا کہ ہر وہ عقیدہ جو روزمرّہ زندگی کے حقائق، مختلف علوم اور سائنس کے مہیارات پہ پورا نہ اُترا اور اُسے شعور کی مکمل تائید حاصل نہ ہوئی، وہ دم توڑ گیا چونکہ ہر شخص نہ اتنا صاحبِ دانش ہوتا ہے، نہ صاحبِ علم کہ وہ عقیدے کو نفسیات، روحانیت اور سائنس کے حوالوں کے ساتھ زیرِ مطالعہ لا سکے۔ اس لئے زیادہ لوگ اپنے سے برتر افراد کے اقوال کو تسلیم کر لیتے ہیں اور یوں انہیں عافیت کا ایک راستہ میسّر آجاتا ہے۔ لیکن برتر دانش رکھنے والے افراد جب تک عقیدے کو عملی اور شعوری طور پہ بھی آزما نہ لیں صداقت کی تلاش کے لئے اپنی کوشش کو نامکمل محسوس کرتے اور بے چین رہتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں جو بار بار سوچنے، غور و فکر کرنے اور عقل سے کام لینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہونا چاہیے۔ عارف عبدالمتین اوّل اوّل مزاج کے زیرِ اثر اور پھر دلائل و براہین کے شعوری عمل سے گزرنے کے بعد قرآن کریم کے اس حکم کی معنویت سے جلد ہی پوری طرح آشنا ہو گیا تھا۔

عارف اس حقیقت کو بھی جان گیا تھا کہ زندگی اور انسانی ذہن کی ساخت بہت پیچیدہ ہے اور اگر انسان شعور کو راہ نما نہ بنائے تو وحشی جذبوں، جبلتوں اور نفسیاتی الجھنوں کی خوراک بن جانا اس کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ زندگی میں داخل اور خارج، فرد اور اجتماع، رُوح اور مادّے اور خالق و مخلوق میں کیا رشتے ہیں، ہر روشن دماغ فرد ان کے بارے میں سوچتا ہے اور جانتا ہے کہ مکمل صداقت کی روشنی ان تمام مسائل پر غور و فکر کرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور یہ کہ روشنی اعلیٰ تر اقدار کی یکجائی سے پھوٹتی ہے لیکن یہ صداقت کرن کرن بکھری ہوئی بھی ملتی ہے۔ اور پہچان رکھنے والی آنکھ اسے ہر جگہ دیکھ لیتی ہے۔ چنانچہ عارف کو ـــــ جہاں بھی صداقت کی کوئی کرن نظر آئی اس نے اسے احترام کی نظر سے دیکھا اور کھلے ذہن سے قبول کر لیا۔ تاہم جزوی اور مکمل صداقت کا فرق اس کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔

عارف کو اس حقیقت کا شعور بہت جلد ہو گیا تھا کہ انسانی دانش، شعور اور اقدار کی مکمل ترین صورت تعلیماتِ اسلام میں اور ان کا اکمل ترین عملی ظہور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں ہوا ہے۔ صداقت کہاں جزوی ہے اور کہاں مکمل اس کا شعور مادی و رُوحانی علوم، تاریخ اور مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اقبال مکمل صداقت تک جزوی صداقتوں کی بہت سی منزلوں سے ہو کر پہنچا تھا اور پھر اسی منزل کا مستقل مکین ہو گیا تھا۔ اقبال کے بعد دنیائے شعر میں علم، تجزیے، مشاہدے اور دلائل و براہین کے حوالے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عظمت کو پہچاننے اور دوسروں کو اس

قابل بنانے والا بڑا نام عارف عبدالمتین کا ہے۔ مکمل صداقت کا شعور اس کے ہاں ثبوت ساتھ لیکر آیا ہے۔ اس شعور نے اس باطنی تحریک اور عقیدے کی صحت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی جو شروع ہی سے عارف کے دل و نظر کو منور کیے ہوئے تھا۔

صداقت کی تلاش میں اختیار کیے گئے کامیاب سفر کا انعام عارف کو فنِ نعت گوئی میں کمال اور نعتوں کے مجموعے "بے مثال" کی صورت میں عطا ہوا۔ اصل میں "بے مثال" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے، لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ عارف کی نعتوں کا یہ مجموعہ اپنے مضامین، اسلوب، جذبے اور رویے کے لحاظ سے بھی واقعتاً بے مثال ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "بے مثال" کہہ کر گویا شاعر نے تعریف و توصیف کی انتہائی حدوں کو چھو لیا ہے۔ "بے مثال" کی ترکیب اتنے گہرے وسیع اور لامحدود معانی کی حامل ہے کہ اس کے بعد "قصہ مختصر" کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت اس نام سے تو پوری طرح واضح ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ عارف نے کسی بھی نعت میں اپنا نام یا تخلص استعمال نہیں کیا تو پتہ چلتا ہے کہ عارف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ اپنا نام استعمال کرنا بھی گستاخی سمجھتا ہے۔ محبت، عقیدت، ادب اور احترام کے اس معیار کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی ذات کو یوں معدوم کر دینے کا عمل اعلیٰ اور نہایت پاکیزہ محبت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

عارف عبدالمتین، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت میں کسی قسم کی بے تکلفی کو راہ نہیں دیتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلامی مقصود ہو یا ان کا ذکر کرنا ہو تو عارف لازم سمجھتا ہے کہ ادب و احترام پوری طرح قائم رکھا جائے۔ چنانچہ عارف نے اپنی نعت کو ایک لمحے کیلئے بھی غزل کی سطح پر نہیں آنے دیا۔ یوں جہاں اس نے فنِ نعت گوئی کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے وہاں عجز و انکسار اور ادب و احترام کی انتہاؤں کو اپنا کر خود اپنا وقار بھی بڑھایا ہے۔ عارف کی نعت کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا سے محبت کے باوجود اس سراپا کا ذکر ایک عام آدمی کی طرح نہیں کرتا بلکہ اس سراپا کو ان عظیم اقدار کا امین جانتا ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع ہو کر ان کو صداقت کا مکمل ترین مظہر بناتی ہیں۔ چنانچہ عارف کی نعت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار، ان کی سیرت اور عظمت ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور محبت کا اظہار ادب و احترام کے ساتھ انہی حوالوں کے ذریعے کیا گیا ہے۔

عارف کا ہر فعل، اس کا ہر قول، اس کی گفتگو، اس کی چال ڈھال غرضیکہ اس کی زندگی کا ہر رویہ خود کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ڈھالنے کی آرزو کا حامل ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عارف نے مکمل صداقت کا شعور حاصل کر لیا ہے۔

عارف عبدالمتین نے جہاں نعت کے لہجہ میں احترام اور وقار کو بنیادی حیثیت دی ہے وہاں اس نے اسلوب اور پیرایۂ اظہار کو بھی مکمل احتیاط کے ساتھ سنوارا ہے۔ اور یوں فنِ نعت گوئی ایک نئی منزل کی جانب بڑھایا ہے۔ عارف سے پہلے بھی نعت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کا ذکر بار بار آیا ہے لیکن جس تسلسل، اہتمام اور احتیاط سے عارف نے اس موضوع کو اپنایا ہے، اس کی کوئی مثال برصغیر میں نہیں ملتی۔ تکنیک میں عارف نے کلاسیکی یعنی قصیدہ کی فارم کو تو دوسرے بہت سے شعراء کی طرح کامیابی سے استعمال کیا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے نظمِ آزاد میں نعت گوئی جس تسلسل سے کی ہے اس کی بھی کوئی مثال اردو میں نظر نہیں آتی۔ بہت سے شعراء نے دو دو چار چار نعتیہ آزاد نظمیں کہی ہیں لیکن عارف نے تسلسل کے ساتھ نظمِ آزاد کو نعت گوئی کے لئے استعمال کر کے اس صنفِ شعر کے مستقبل کے ایک روشن پہلو کی نشاندہی کر دی ہے۔

عارف عبدالمتین نے اردو نعت کے سرمائے میں بے حد خوبصورت اور گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس سرمائے میں قیمتی اضافے اس کے بعض ہمعصروں نے بھی کئے ہیں، لیکن عارف کی نعت اپنے لہجے، اسلوب اور مضامین کے اعتبار سے ایک الگ اور ارفع تر مقام کی حامل ہے اور ایک انفرادی شان رکھتی ہے۔

ہفت رنگ

محمد خالد جذبی

اُردو کے سات معروف نعت گو شعراء احمد ندیم قاسمی،
عارف عبدالمتین، عاصی کرنالی، حفیظ تائب، مظفر وارثی،
محمد افضل فقیر اور عابد نظامی کی سات سات منتخب نعتوں
اور کوائف و تاثرات کا بہترین مجموعہ۔

ضخامت ۱۱۲ صفحات ٭ قیمت ۲۵ روپے

وطن پبلیکیشنز گوجرانوالہ